© rasailojaraid.com

سید محمد کفیل بخاری

دل کی بات

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی ڈھلتی شام کا وہ کربناک منظر آج بھی مجھے یاد ہے۔ ایک طرف آفتاب جہاں تاب ڈوب رہا تھا اور دوسری طرف آفتاب خطابت غروب ہو رہا تھا۔ میری عمر اس وقت پونے چار برس تھی۔ میرے سب سے بڑے ماموں حضرت سید ابومعاویہ ابوذر بخاری مدظلہ میری انگلی پکڑ کر دوڑتے ہوئے مجھے میرے نانا ابا جی کی چارپائی کے قریب لے آئے۔ اور فرمایا بیٹا اپنے نانا ابا جی کو آب زمزم پلاؤ۔ میں نے چمچ ان کے ہونٹوں کے قریب کیا تو انہوں نے منہ کھول دیا اور آخری مرتبہ میرے ہاتھ سے زمزم پیا۔ اس وقت ان کی آنکھیں بند تھیں اور زبان پر کلمۂ توحید کا ورد جاری تھا۔ وہ اپنے مستقر کی جانب رخت سفر باندھ کر ہمیشہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ سب لوگ اشکبار تھے۔ میں نے سنا، وہ کہہ رہے تھے، اب یہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی ہیں۔ اب ان کے دیکھنے کو ہماری آنکھیں ہمیشہ ترستی رہیں گی۔ حکیم عطاء اللہ خان مرحوم، جو نہ صرف ان کے معالج خاص تھے بلکہ مخلص ترین دوست بھی تھے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے شاہ جی کا بخار مقیاس حرارت کے تمام درجوں کو عبور کر چکا تھا۔ حکیم صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا "شاہ جی! بخار اتر گیا؟ شاہ جی! آرام آ گیا؟۔ شاہ جی! "صحت ہو گئی؟" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ سارا ماحول حزن و یاس کی کیفیتوں میں ڈوب گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرے نانا ابا جی، جنہیں ان کے لاکھوں چاہنے والے محبت سے "شاہ جی" کہتے ہیں کہیں دور بہت دور جا چکے ہیں۔ جہاں سے لوٹ کر کبھی کوئی نہیں آیا۔

میں نے انہیں شعور کے ساتھ نہیں دیکھا۔ مگر ان کی سیرت کے دل افروز نقوش کا سب سے پہلے اپنے ہی گھر میں شعور کے ساتھ مشاہدہ کیا۔ نانی اماں۔۔۔ (جنہیں حلقۂ احرار کے سبھی بزرگ اور خورد "اماں جی" کے مقدس نام سے پکارتے) کا وجود مسعود پورے خاندان کے لئے ابر رحمت اور دعاؤں کا حصار تھا۔ میں نے ان کی عصمت مآب زندگی میں شاہ جی کی پاکیزہ اور اولوالعزم زندگی کا عکسِ جمیل دیکھا۔ انہوں نے بیوگی کی تیس منزلیں جس ہمت اور عزم کے ساتھ عبور کیں اس سے یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ گئی کہ اس عفت مآب ماں نے شاہ جی کی قید و بند اور مصائب بھری زندگی سے کس ہمت کے ساتھ نباہ کیا۔ میری والدہ ماجدہ اور پھر چاروں ماموں۔ جن کی تربیت میں اماں جی رحمتہ اللہ علیہا نے ہی اہم کردار ادا کیا تھا آج اپنے عظیم باپ کے آخلاق و کردار کا حسین پر تو ہیں۔ یہی بات کیا کم ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کا کفن نہیں بیچا۔ شاہ جی کے بعض نام نہاد محبین کے پیہم ظلم و ستم، بے وفائی اور چیرہ دستیوں کے باوصف احرار کا چراغ مصطفوی جلائے رکھا۔ جس کی حقیقت افروز روشنی کے سامنے شرار بولہبی نے دم توڑ دیا۔ میں نے بچپن سے جوانی تک کے لیل و نہار اسی گھر میں گزارے۔ اور انہی روشن صورتوں میں شاہ جی کو چلتے پھرتے دیکھا۔۔۔ زندۂ جاوید شاہ جی۔

میں نہیں جانتا کہ شاہ جی کیا تھے اور انہوں نے کیا کام کیا؟ میں نے شاہ جی کو انہی مستند حوالوں سے جانا اور پہچانا ہے۔ میں ان بستیوں میں گھوما پھرا جنہیں شاہ جی نے "بنجر زمینیں" قرار دیکر ان میں ہل جوتے اور وفا کی فصل کاشت کی تھی۔ تب شاہ جی کا کام سمجھ میں آ گیا۔۔۔ انہوں نے اپنے علم و عمل اور نظریئے کو جن دماغوں میں منتقل کیا وہ گھاٹا نقش ہی ابھر ہیں۔ انہوں نے سرد فضاؤں کو اپنی شعلہ بیانیوں سے ایسا گرم کیا کہ صدیوں تک اس کی شدت و حرارت محسوس کی جاتی رہے گی۔ انہی گرم فضاؤں میں پہنچ کر مجھے ان کے مقام و مرتبے کا ادراک اور عرفان نصیب ہوا۔ انہوں نے برف سے زیادہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ٹھنڈے انسانوں کو متحرک کیا، ان کے کانوں میں غیرت و حمیت کا صور پھونکا، انہیں دین کا سچا سپاہی بنایا اور ان کے دل و دماغ پر اپنے نقوشِ عمل یوں جما دیئے کہ پھر وہ امتدادِ وقت کے باوجود نہ مٹ سکے اور نہ مٹائے جاسکے۔ وہ ہمہ صفت موصوف تھے۔ خطیب، مدبر، مصلح، سیاست دان، عالم دین، شاعر، غرض اس پیکر صدق و صفا میں خوبیوں کا اک جہان آباد تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک سچے اور عظیم مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنے عہد میں زندگی کے ہر شعبے کے افراد کو متاثر کیا۔ مختلف الخیال اور متضاد طبیعتوں کے حامل افراد کو مجتمع کر کے نہ صرف انہیں ہم خیال بنایا بلکہ ان کے قدم ملا کر سرفروشوں اور بہادروں کا قافلۂ احرار تشکیل دے دیا۔

ہوئی تیغ حق بے نیام اللہ اللہ

پھر یہی قافلۂ احرار پوری آب و تاب کے ساتھ شپرہ چشموں کی عیب چینی سے یکسر بے نیاز ہو کر وقت کی سب سے بڑی جابر نصرانی حکومت سے ٹکرا گیا۔ ایک مقصد عالی کی خاطر اپنی کڑکتی جوانیوں کے بیس بیس برس پسِ دیوارِ زنداں بسر کر ڈالے۔ ظلم کا ہر ڈھنگ ان مردانِ احرار پر آزمایا گیا مگر انہیں جھکایا نہ جاسکا۔ بالآخر برصغیر سے انگریزی اقتدار کی بساط لپیٹ دی گئی لیکن افسوس کہ اپنے خون سے حریت کی داستانیں رقم کرنے والوں اور متاعِ دین و دانش کی حفاظت کے لئے مرمٹنے والوں کے سب خواب ادھورے، دل و جاں کے سارے خروش کو مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ وہ حادثات کی پیداوار سیاسی مخلوق کے شب خون کا شکار ہوگئے۔ جس دھرتی کی آزادی کے لئے انہوں نے اپنا سب کچھ نثار کیا اس کے ضمیر فروش اور چھچھورے حکمرانوں، تیرہ باطن تاریخ نویسوں، قلم فروش صحافیوں اور کرائے کے دانشوروں نے انہیں "غدار" سمجھا۔ لیکن تابکے؟

سچائی، حقیقت اور واقعہ یہی ہے کہ اب جھوٹ کی نیا ڈوب چکی ہے۔ ڈوب رہی ہے۔ پوری قوم جان چکی ہے کہ

بد تر ہے جانور سے بھی دانشوروں کا حال
جو سوچتا نہیں ہے وہ انساں ہے ان دنوں

حقیقت خود کو منوا رہی ہے۔ لوگ زبانِ حال سے پکار رہے ہیں کہ خدا تم ہی سچے تھے۔ لیکن آہ۔۔۔

دل زدگاں کے قافلے دور نکل چکے تمام
ان کی تلاش میں نگاہ اب جو گئی تو کیا گئی

اگست ۱۹۹۲ء کی ایک شام۔۔۔ میں لاہور میں اپنے رفقاء فکر، عبداللطیف خالد چیمہ، پروفیسر محمد عباس نجمی، پروفیسر شاہد محمود کاشمیری، محمد رفیق اختر، محمد عمر فاروق، میاں محمد اویس اور رانا محمد فاروق کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ اچانک گفتگو کا رُخ اور طرف مُڑ گیا۔ محترم محمد عباس نجمی نے کہا ۱۹۹۲ء میں حضرت امیر شریعت کا صد سالہ یوم ولادت ہے۔ اس موقع پر نقیبِ ختمِ نبوت کا ایک یادگار نمبر شائع ہونا چاہیے۔ اس سمے، میں نے سوچا کہ اس بار سے کیوں کر سبک دوش ہوں؟ مگر دوسرے لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان شاء اللہ یہ کام میں ہی سرانجام دوں گا۔ رفقاء نے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ تفصیل میں نہیں جاتا کہ کس نے کتنا تعاون کیا۔ بس اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ سب نے ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کی۔

اعلان کے مطابق یہ نمبر اکتوبر ۱۹۹۲ء میں چھپ جانا چاہیئے تھا مگر مجھے اس بھاری کام کا اندازہ نہ تھا۔ پھر یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ ادھر قارئین کی طلب و اصرار شدت اختیار کر گئے۔ دسمبر ۱۹۹۲ء میں کتابت مکمل ہوئی اور جنوری ۱۹۹۳ء میں یہ تاریخی نمبر منصۂ شہود پر آرہا ہے۔ اگر کتابت شدہ تمام مواد شاملِ اشاعت کیا جاتا تو ایک ہزار سے زائد صفحات پر پھیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتا۔ ظاہر ہے کہ اتنی ضخامت کے ساتھ موجودہ قیمت پر قارئین کو مہیا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ۶۴۰ صفحات پر مشتمل حصہ اوّل آپ کے ہاتھوں میں ہے جبکہ حصہ دوم ان شاءاللہ ۱۹۹۳ء میں ہی ہدیہ قارئین کیا جائے گا۔ اس مجموعہ میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں طرح کے مضامین شامل ہیں۔ شاہ جی پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ تمام مواد ہزاروں صفحات پر پھیل جائے۔ ہماری کوشش ہے کہ بکھرے ہوئے تمام مقالات و مضامین تسلسل کے ساتھ شائع کئے جائیں۔

زیرِ نظر مجموعہ میں جو خامیاں رہ گئی ہیں وہ میری کوتاہیاں ہیں۔ قارئین تصحیح فرمائیں تو اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اس کارِ خیر کی تکمیل میں والدہ ماجدہ اور اپنے محسن ماموں سید عطاء المحسن بخاری مدظلہ کی بھرپور سرپرستی نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ ان کی یادداشتوں سے میں نے بھرپور استفادہ کیا۔

برادر محترم شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی اور برادر عزیز سید محمد ذوالکفل بخاری نے حروف خوانی سے لیکر ترتیب و تزئین تک میری مکمل دستگیری فرمائی۔ برادرم ابو میسون اللہ بخش احرار نے دن رات ایک کرکے اپنی نگرانی میں طباعت کے تمام مراحل طے کرائے۔ محترم شبیر احمد میواتی نے شاہ جی کا آٹو گراف فراہم کیا جو خدا بخش لائبریری پٹنہ (انڈیا) سے شائع ہوا۔ اور اس مجموعہ کی زینت بنا۔ محترم جاوید اختر بھٹی صاحب کے مفید مشوروں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔

میں شکریہ کے روایتی اظہار سے گریز کررہا ہوں کہ وہ محض الفاظ کی شاہ خرچی ہے۔ جتنے دوستوں، بزرگوں کا اوپر ذکر کر آیا ہوں ان سب کے لئے دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ انہیں اس تعاون پر جزاء خیر عطاء فرمائے (آمین) شکر۔۔۔ اللہ کا ادا کرتا ہوں جس نے مجھے اس بار سے سبک دوش ہونے کی توفیق بخشی اور دوستوں کو میرا معاون بنایا۔

میں نے جس گھر میں ہوش کی آنکھ کھولی اور شعور کی دولت پائی اب اس میں شاہ جی ہیں نہ اماں جی۔ مگر

اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

شاہ جی کے حضور نذرانہ عقیدت کے طور پر یہ چند آنسو حاضر ہیں۔

ہر چند بگولہ مضطر ہے، اِک جوش تو اُس کے اندر ہے
اِک وجد تو ہے، اِک رقص تو ہے، بے چین سہی، برباد سہی

والسلام

سراپا احرار

۲۰ جنوری ۱۹۹۳ء

© rasailojaraid.com